ڈاکٹر ابرار عبدالسلام
ناظم امتحانات
ایمرسن یونی ورسٹی، ملتان

اردو کے ادبی رسائل میں تعزیتی شذرات کی روایت اور ''نعت رنگ''

ABSTRACT

Tradition of Condolence writings in Urdu literary magazines and "*Naat Rang*"

Dr.Abrar Abdulsalam, Controller of Examinations, Emerson University Multan,

Urdu literary journals do not have a strong tradition of condolence writings, but some journals have published writings on important literary figures who died in the contemporary era. In the early days of literary journals, condolence writings were occasionally published, but in later times this became the focus of attention. 'Ma'arif' and 'Burhan' paid constant attention to this. 'Naat Rang' carried on this tradition and more than one hundred condolence writings were published in it. ,These articles are related to the poets and writers who have had some work on Naat. This article sheds light on this.

Keywords: Sabeeh Rahmani, Naat Magazines, 'Naat Rang', Naat poets, Condolence Writing, Literary Magazines, Deaths, Religious Magazines, Personalities, Tradition, History.

تعزیتی شذرات، تعزیتی مضامین یا وفیات نگاری کے حوالے سے اردو کے ادبی رسائل کی روایت کا مطالعہ کیا جائے اور ماضی میں وفات پانے والے ادیبوں کی خبریں ان کے معاصر عہد کے رسائل میں تلاش کی جائیں تو بہت کم رسائل اس تلاش میں ہمیں مدد دے پائیں گے اور اگر ایسے رسائل ڈھونڈھنے کی کوشش کی جائے جن میں معاصر ادیبوں کی وفات سے متعلق تعزیتی مضامین باقاعدگی اور تسلسل سے شائع ہوتے رہے ہوں تو رسائل کے دفینوں اور متعدد رسائل و جرائد کے انبار سے ایسے مضامین کی تلاش ایک مشکل امر ہوگا۔ البتہ تعزیتی مضامین کی اس کمی کو بیسویں صدی کے رسائل میں شخصیات کے حوالے سے قائم کردہ گوشے یا خاص نمبر ضرور پورا کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ رسائل میں موجود متذکرہ مضامین کی صورتیں دو قسم کی شخصیات سے متعلق نظر آتی ہیں۔ یا تو وہ سربرآوردہ شخصیات ہوتی تھیں یا وہ شخصیات جن کا رسائل انتظامیہ سے خاص تعلق رہتا تھا۔ تیسری صورت ذرا کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ بعض اوقات تو قدآور شخصیات بھی نظر اندازی یا کم نظری

کا نوحہ کرتی نظر آتی ہیں۔محمد حسین آزاد(۱۹۱۰-۱۸۳۰) کا نام اور مقام کسی سے پوشیدہ نہیں۔۱۹۱۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔[۱] اس وقت ہندوستان سے اردو کے کثیر تعداد میں رسائل شائع ہو رہے تھے۔ان رسائل میں 'اردوئے معلیٰ' (علی گڑھ)، 'مخزن'(لاہور)، 'زمانہ'(بریلی، کانپور)، 'ادیب'(الہ آباد)، 'الندوہ'(لکھنؤ)، 'الناظر'(لکھنؤ)، 'لسان العصر'(لکھنؤ)، 'تمدن'(دہلی)، 'کمال'(دہلی)، علی گڑھ منتھلی (علی گڑھ)، 'دبدبہ آصفی'(حیدرآباد)، اہمیت کے حامل ہیں۔اس عہد کے رسائل میں ایک بھی رسالہ ایسا نہیں جس نے آزاد کا خاص نمبر نکالا ہو یا رسالے میں کوئی گوشہ قائم کیا ہو۔آزاد کی وفات کے بعد کی دو تین دہائیوں میں ادبی رسائل کی ایک مزید لہر نے ادبی فضا کو مزید گرما دیا تھا۔اس وقت دہلی،لکھنؤ، بمبئی، الہ آباد، بھوپال، حیدرآباد اور لاہور ادبی رسائل کے مراکز کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کر چکے تھے۔اس عہد کے رسائل میں 'معارف'(اعظم گڑھ)، 'دل گداز'(لکھنؤ)، 'صبح امید'(لکھنؤ)، 'نیا ادب'(لکھنؤ)، 'ادب'(لکھنؤ)، 'پیمانہ' (آگرہ،لکھنؤ)، 'مرقع' (لکھنؤ)، 'نقیب' (بدایوں)، 'اردو'(اورنگ آباد)، ''اردو'(الہ آباد)، 'ہندستانی'(الہ آباد)، 'چاند'(الہ آباد)، 'ادیب'(آگرہ)، 'ندوہ'(شاہ جہان پور)، 'نقاد'(آگرہ)، 'شمع'(آگرہ)، 'صحیفہ'(اٹاوہ)، 'تاج'(حیدرآباد)، 'نظارہ' (میرٹھ)، 'نقیب' (بدایوں)، 'عصمت' (دہلی)، 'ساقی'(دہلی)، 'ادیب' (دہلی)، 'کلیم' (دہلی)، 'برہان'(دہلی)، 'آج کل'(دہلی)، 'جامعہ'(دہلی)، 'سہیل' (علی گڑھ)، 'نگار' (بھوپال،لکھنؤ) معروف رسائل رہے ہیں۔ لاہور سے شائع ہونے والے رسائل کی بھی ایک بڑی تعداد رہی ہے۔ 'کہکشاں'، 'ہزار داستان'، 'عالمگیر'، 'نیرنگ خیال'، 'ادبی دنیا'، 'ہمایوں'، 'شاہکار'، 'ارمان' کے علاوہ بھی کئی رسائل لاہور سے شائع ہو رہے تھے لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ کسی رسالے نے بھی آزاد کا نمبر نکالا نہ کوئی گوشہ ہی قائم کیا۔آزاد کے انتقال کے تقریباً تہتر سال بعد ۱۹۸۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے 'راوی' کا آزاد نمبر شائع ہوا۔[۲] یہ ہندو پاک کا واحد رسالہ ہے جس نے محمد حسین آزاد نمبر نکالا۔تقسیم ہند سے قبل تک کسی رسالے کو توفیق نہ ہوئی کہ ان کے اعتراف خدمات میں کوئی نمبر یا گوشہ نکالتے۔ یہ تو ایک مثال ہے۔ایسی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

انیسویں اور بیسویں صدی کے اخبارات اور رسائل میں سے ایسے اخبارات و رسائل کا شمار کیا جائے جن میں معاصر ادیبوں اور شاعروں کی وفات پر خبروں کا اہتمام کیا جاتا ہو، ایسے اخبارات و رسائل سے مطلوبہ مواد کی جمع آوری آسان کام نہیں۔ البتہ تلاش بسیار کے بعد بعض رسائل و اخبارات ایسے ضرور مل جائیں گے جو بے قاعدگی کے ساتھ معاصر ادیبوں کی وفات کی خبروں کو شامل اشاعت کیا کرتے تھے۔ اس قسم کے رسائل کی تعداد بھی انگلیوں پر شمار کی جاسکتی ہے۔فوت ہونے والے ادیبوں سے متعلق رسائل میں جگہ پانے والی خبریں بالعموم اداریوں کا حصہ ہوا کرتی تھیں۔تاہم انیسویں صدی کے اخبارات سے بیسویں صدی کے رسائل تک معاصر ادبی شخصیات کی وفات سے متعلق قطعات تاریخ اکثر و بیشتر رسائل میں ضرور دیکھنے میں آتے ہیں۔انیسویں صدی میں تو قطعات تاریخ کی تخلیق و اشاعت ہر کتاب، رسالے، عمارت، کتبے کی ضرورت سمجھی جاتی تھی اور کسی شاعر کی تخلیقی صلاحیت کا اعتراف اس وقت تک کیا ہی نہیں جاتا تھا جب تو وہ اس فن پر دسترس کا

عملی ثبوت فراہم نہ کردے۔[۳] کم وبیش ہر معروف مطبع میں کاتب کے ساتھ تاریخ گو شاعر بھی جڑا ہوا کرتا تھا جس کے ذمے داری یہ ہوا کرتی تھی کہ وہ مطبع سے شائع ہونے والی کتابوں کی تاریخ کہے۔ اگر مطبع کے پاس یہ سہولت نہ ہوتی تو یہ خدمت مستعار لی جاتی۔ بہر حال انیسویں صدی کے اخبارات میں معاصر شعرا و ادبا کی زندگی کے اہم واقعات بالخصوص وفات کی تاریخیں ضرور شائع ہوا کرتی تھیں۔ 'اودھ اخبار' لکھنؤ کے نومبر دسمبر ۱۸۷۹ء کے تین شماروں میں غالب کے شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کی وفات کی ۳۷ تاریخیں (قطعات تاریخ) شائع ہوئیں۔[۴]

بیسویں صدی کے رسائل میں بھی قطعات تاریخ وفات کی اشاعت کا اہتمام دیکھنے میں آیا ہے۔ بعض رسائل تو انتقال کرنے والی شخصیت سے متعلق قطعہء تاریخ وفات کہہ کر بھیجنے کا اعلان بھی شائع کرتے تھے۔ خواتین رسائل میں 'خاتون' علی گڑھ بہت اہمیت کا حامل رسالہ تھا۔ اس رسالے میں بالعموم خواتین ہی کی تحریریں شائع ہوا کرتی تھیں۔ رابعہ سلطان بیگم جن کی تحریریں اس رسالے میں شائع ہوتی تھیں۔ ان کے شوہر فوت ہوئے تو ایڈیٹر نے اداریے میں ان کی وفات کی تاریخ کہنے کی اپیل کی۔ ایڈیٹر لکھتی ہیں: ''ہماری نہایت لایق و روشن خیال بہن رابعہ سلطان بیگم صاحب جن کے بہت سے مضامین خاتون میں شایع ہوتے رہے ہیں نہایت افسوس ہے کہ ایسا روح فرسا اور جانکاہ صدمہ بے وقت ان پر پڑا جس سے بڑا اور کوئی صدمہ اس دنیا میں کسی عورت کے لیے نہیں ہوسکتا یعنی ابھی ایک سال کا زمانہ گزرا کہ ان کی شادی میر تہنیت علی خان صاحب سکرٹری جٹپول اسٹیٹ کے ساتھ ہوئی تھی۔ کس کو معلوم تھا کہ یہ خوشی چند روزہ ہے۔ افسوس میر تہنیت علی خاں نے ۲ تیر ۱۳۲۰ ف کو چار بجے شام کے انتقال فرمایا۔ ان کا انتقال دوشنبہ کے دن ہوا جو ہمارے پیغمبر کی وفات کا دن ہے۔۔۔ عباسی بیگم صاحبہ کی فرمائش ہے کہ ناظرین و ناظرات خاتون میں سے جو قطعہ تاریخ لکھ سکتے ہیں وہ ازراہِ ہم دردی فارسی یا اردو میں جس زبان میں ہوسکے لکھ دیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے ناظرین و ناظرات اس استدعا کی طرف توجہ فرمائیں گے۔ جب کہیں تو اس کو ہمارے پاس بھیج دیں۔ ہم 'خاتون' میں شائع کر دیں گے یا عباسی بیگم صاحبہ کے پاس بھیج دیں گے۔ سنہ تاریخ کے لیے فصلی کے بجائے ہجری یا عیسوی سنہ زیادہ موزوں ہوگا۔[۵] اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ عمل متروک ہوتا گیا لیکن اہم بات یہ ہے کہ یہ عمل بیسویں صدی کے اختتام تک کم وبیش جاری رہا۔ 'قومی زبان' کراچی میں توشیم صبا متھراوی کم و بیش چالیس سال تک ''گزشتہ سال جدا ہم سے ہو گئے یہ لوگ۔۔۔'' کے عنوان سے معاصر شخصیات کی وفات کی تاریخیں کہہ کر شائع کرواتے رہے۔ 'الولی' حیدرآباد کے شماروں میں اکرام حسین سیکری کی 'مشاہیر سندھ کی تاریخ ہائے وفات، شخصیات سندھ، ادیبوں اور شاعروں، مشاہیر ملت، مشاہیر چین، اور مشاہیر عالم کے سال ہائے وفات/انتقال کے عنوانات سے متذکرہ سالوں میں فوت ہونے والی شخصیات کی کہی ہوئی تاریخیں شائع ہوئی ہیں۔[۶] ان کے علاوہ معاصر شخصیات کی وفات پر جستہ جستہ تعزیتی مضامین، نوحے اور مرثیے بھی دیکھنے میں آتے ہیں لیکن یہ روایت کسی بھی رسالے میں تواتر کے ساتھ نظر نہیں آئی۔ بہت کم رسائل ایسے دیکھنے میں آتے ہیں جو معاصر ادیبوں کی وفات پر مفصل تعزیتی مضمون شائع کیا کرتے تھے۔

اس حوالے سے سب سے اہم ادبی رسالہ 'معارف' اعظم گڑھ تھا جو اپنے شماروں میں ادیبوں کی وفات پر مفصل تعزیتی شذرہ قلم بند کیا کرتا تھا۔ 'معارف' میں شائع ہونے والے شذرات میں فوت ہونے والی شخصیت کی ادبی، علمی اور نجی زندگی کا تذکرہ اختصار مگر جامعیت سے کیا جاتا اور فوت ہونے والی شخصیت کی علمی و ادبی کارگزاریوں پر خراج تحسین پیش کیا جاتا تھا۔ 'معارف' میں ۱۹۱۶ء تا ۲۰۱۲ء تک چھیانوے سال میں ۸۳۷ شخصیات کی وفیات قلم بند کی گئیں۔ 'معارف' میں شائع ہونے والی وفیات کو ڈاکٹر سہیل شفیق نے مرتب کر کے شائع کروا دیا ہے۔(۷) 'برہان' دہلی ۱۹۳۸ء تا ۲۰۰۱ء شائع ہوتا رہا۔ اس رسالے میں بھی تعزیتی شذرات شائع ہوتے رہے۔ مولانا سعید اکبر آبادی نے دوران ادارت ۲۴۵ وفیات خود تحریر کی ہے۔ ان وفیات میں انھوں نے انتہائی معتدل اور مثبت انداز میں شخصیات کے سوانح اور علمی و ادبی کارگزاریوں کو تعزیتی مضامین کا حصہ بنایا ہے۔ ان کا انداز اس قدر دلچسپ ہوا کرتا تھا کہ مرحوم شخصیت کا پورا خاکہ قاری کی نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔(۸) اسی طرح 'فاران' میں ماہر القادری (۱۹۰۷-۱۹۷۸) ''یادرفتگاں'' کے عنوان سے فوت ہونے والے ادیبوں، شاعروں، اسکالروں اور اہم شخصیات سے متعلق تعزیتی شذرات قلم بند کیا کرتے تھے۔ یہ فقط تعزیتی تحریریں ہی نہ ہوتی تھیں، فوت ہونے والے ادیب کی زندگی کا مختصراً نچوڑ بھی ہوا کرتا تھا۔ ان وفیات سے ماہر القادری اور فوت ہونے والی شخصیات کے باہمی تعلقات پر روشنی بھی پڑتی ہے اور شخصیت کی علمی و ادبی زندگی کی کارگزاریاں بھی سامنے آتی ہیں۔ ماہر القادری اپنے موضوع پر (وفیات میں) اس عالمانہ شان سے قلم اٹھاتے تھے کہ شخصیت کی عظمت بھی تمام و کمال کے ساتھ ابھر کر سامنے آتی تھی اور ماہر القادری کا علمی تبحر بھی ہماری آنکھوں سے پوشیدہ نہ رہتا۔ ماہر القادری کی تحریر کردہ وفیات کی ایک خوبی خلوص اور دردمندی بھی ہے جس سے مصنف اور شخصیت کی قربت اور قریبی تعلق کا پتا چلتا ہے۔ ایک صدی سے زائد عرصہ پر محیط سیکڑوں رسائل و جرائد کی تاریخ کے مطالعے کے بعد متذکرہ تین ایسے رسائل دستیاب ہوئے ہیں جن میں تواتر اور تسلسل کے ساتھ تعزیتی شذرات تحریر کیے جاتے تھے۔ تلاش بسیار کے بعد اس سطح کے مزید رسائل کی نشان دہی نہیں ہو سکی۔

اسی روایت کو مدیر 'نعت رنگ' نے آگے بڑھایا۔ 'نعت رنگ' کے بیشتر شماروں میں متذکرہ روایت کے بھرپور نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ نقوش مدیر نعت رنگ نے ''نئے دکھ'' کے عنوان سے تحریر کیے ہیں۔ تعزیتی شذرات میں ان شعرا و ادبا کی وفیات کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے نعت یا 'نعت رنگ' سے جڑے رہے اور یہی تعلق ان کی تعزیت نگاری/ وفیات نگاری کا سبب بنا۔ 'نعت رنگ' میں شامل تعزیتی شذرات دو طرح کے ہیں۔ تفصیلی بھی اور مختصر بھی۔ کہیں دو دو چار چار سطروں میں فوت ہونے والی شخصیت کا تذکرہ کیا گیا ہے اور کہیں تفصیل سے فوت ہونے والی شخصیات کی شخصی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور نعت سے متعلق خدمات کو مؤثر اور دل نشیں اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ دونوں طرح کی تحریروں میں مشترک دکھائی دینے والا عنصر، لکھنے والے کی نعت سے گہری وابستگی، خلوص اور مرنے والی شخصیات سے قلبی تعلق ہے۔ مدیر 'نعت رنگ' کی تحریر کردہ وفیات صحافیانہ ہیں نہ غیر شخصی۔ ان کا عمومی انداز شخصی اور موضوعی رہا ہے۔ ان کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہوئے

قاری محسوس کرسکتا ہے کہ یہ وقت گزاری کا سامان نہیں بلکہ ان کے باطن سے پھوٹتی ہوئی تحریریں ہیں یا مرنے والے کی وفات کا جو تاثر مدیر پر طاری ہوا، اس کا بلا کم و کاست اظہار تحریری تعزیت کی صورت متشکل ہو گیا۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ شذرات تاثر ہوتے ہوئے بھی فقط جذباتی اظہاریے نہیں، ان کے عقب میں مصنف کی تنقیدی صلاحیت اور تحقیقی جوہر پورے آب و تاب سے جھلکتا نظر آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ شذرات/مضامین، ان کی ادبی زندگی کا بامعنی نچوڑ ہیں۔ صبیح رحمانی (پ۔۱۹۶۵) نے تعزیتی شذرات میں مختصر مگر جچی تلی لفظیات کے ذریعے فوت ہونے والی شخصیت کی لفظی تصویر کشی اور ان کے علمی و ادبی مرتبے کا تعین کر دیا ہے۔

'نعت رنگ' میں وفیات نگاری کا آغاز دوسرے شمارے میں دیکھنے میں آتا ہے۔ دوسرے شمارے کے اداریے میں مدیر 'نعت رنگ' نے آفتاب احمد نقوی (۱۹۹۵-۱۹۵۱)، مولانا عبدالعزیز شرقی (۹۵۱۹-۱۹۰۵) اور اختر لکھنوی (۱۹۹۵-۱۹۳۵) کی وفات پر قدرے مفصل تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ شمارہ نمبر تین میں ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی (۱۹۹۶-۱۹۳۱)' افسر ماہ پوری (۱۹۹۶-۱۹۱۸)، صہبا اختر (۱۹۹۶-۱۹۳۰/۳۱) اور رضی دہلوی (و۔۱۹۹۶) کی وفات پر اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی کی وفات پر قریباً ایک پیراگراف اور باقی کے حوالے سے ایک ایک دو دو سطروں میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ تیسرے شمارے کے بعد ساتویں شمارے تک کسی شمارے میں وفیات کا تذکرہ نظر نہیں آتا البتہ آٹھویں شمارے کے اداریے میں اقبال صفی پوری (۱۹۹۹-۱۹۱۶)، شمیم جے پوری (۱۹۹۹-۱۹۲۹)، خالد بزمی (۱۹۹۹-۱۹۳۲)، الحاج قمرالدین احمد انجم (۱۹۹۹-۱۹۲۶)، الحاج محمد علی ظہوری قصوری (۱۹۹۹-۱۹۳۲)، الحاج محمد اختر سدیدی (۱۹۹۹-۱۹۲۷) کی وفات پر فقط اظہار تعزیت اور دعائے مغفرت پر اکتفا کیا گیا ہے البتہ نویں شمارے میں وفات پانے والی شخصیات کا دو دو سطری تعارف پیش کر کے مقصد پوار کر لیا گیا ہے جو اس بات کا عکاس ہے کہ ابتدا میں مدیر وفیات نگاری کی طرف خصوصی توجہ دے نہیں پاتے تھے۔ باقاعدگی اور تواتر سے یہ رجحان بیسویں شمارے کے بعد دیکھنے میں آتا ہے۔ ابتدائی شماروں میں وفیات نگاری کی کمی یادنگاری، گوشوں کے قیام اور متن میں شامل اکا دکا تعزیتی مضامین سے پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بیسویں شمارے کے بعد وفیات نگاری کا عمل جس تواتر کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ برآمد کرنا مشکل نہ ہوگا کہ اب مدیر تعزیتی شذرات لکھنے کی طرف دل جمعی کے ساتھ توجہ دینے لگے ہیں۔ راقم السطور کے خیال میں غالباً یہ مدیر کی اس سوچ کا عکاس ہے کہ تعزیتی شذرات سے حق تعزیت ہی ادا نہیں ہوتا، مرنے والے کی خدمات کے اعتراف سے کسی حد تک ادبی قرض بھی ادا ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی بچھڑنے والے کی یادوں کو تازہ کرنے سے کیتھارسس کا موقع بھی مل جاتا ہے۔(۹)

''نعت رنگ'' کے تیس شماروں میں ۱۳۰ سے زائد شخصیات کی وفات پر اظہار افسوس کیا گیا ہے۔ تعزیتی شذرات اس سے کہیں زیادہ تحریر کیے جاسکتے تھے لیکن بعض وجوہات کی بنا پر ان کی تعداد میں اضافہ نہ ہو سکا۔ کبھی کبھی ''نعت رنگ'' کو

مرتب کرتے کرتے خاصی تاخیر ہوجاتی تھی، چناں چہ تعزیتی شذرات رمضامین لکھنے کے عمل کو ملتوی یا مؤخر کردیا جاتا۔اس کا ایک سبب وقت کی گنجائش کی عدم فراہمی بھی ہوا کرتی تھی۔مدیر کا نقطۂ نظر یہ ہوتا تھا کہ اس صورت حال میں تعزیتی شذرات لکھنے کے عمل میں وقت صرف کرنے سے رسالے کی اشاعت مزید تاخیر کا سبب بن کر ''نعت رنگ'' کے قارئین کے لیے تکلیف کا باعث بن سکتی ہے چناں چہ ایسے مواقع پر مدیر نے بادلِ نخواستہ تعزیتی مضامین لکھنے سے گریز کیا ہے اور اس التوا کے حوالے سے اداریوں میں موقع بہ موقع ذاتی قلق کا اظہار بھی کیا ہے۔اس قسم کا اظہار ابتدائی شماروں میں زیادہ نظر آتا ہے۔شمارہ نمبر ۲۴ میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری (۲۰۱۳-۱۹۲۶)، اسید الحق بدایونی (۲۰۱۴-۱۹۷۵)، رہبر چشتی (۲۰۱۳-۱۹۲۹)، مہر وجدانی (۲۰۱۳-۱۹۳۰) اور سجاد مرزا (۲۰۱۳-۱۹۴۴) کی وفات پر صرف نام لکھنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔کچھ شخصیات ایسی بھی ہیں جن پر ایک ایک دو دو سطروں میں تعزیت کر کے حق تعزیت ادا کر دیا گیا ہے۔ایسا ابتدائی تحریروں میں زیادہ دیکھنے میں آیا ہے۔بیسویں شمارے کے بعد یہ طرزِ عمل مفقود نظر آتا ہے۔اس کے چار سبب ہو سکتے ہیں۔ایک تو معلومات اور تجربے کا فقدان کہ ابتدائی شماروں میں مدیر کو وفیات نگاری کی ضرورت اور اہمیت کا وہ احساس نہیں ہوا ہوگا جو بعد میں پیدا ہوا۔دوسرا روایت کی عدم موجودگی جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے، تیسرا رسائل کی ضخامت کے مسائل اور چوتھا وقت کی کمی۔ابتدا میں ان چاروں اسباب میں سے ہر بار کوئی نہ کوئی سبب وفیات نگاری کے اندراج میں رکاوٹ کا باعث بنتا رہا۔اسی وجہ سے ابتدائی شماروں میں وفیات نگاری کی کمی اور بے قاعدگی دیکھنے میں آتی ہے لیکن جیسے ہی تجربے نے اپنی مدت پوری کی، مالی آسودگی حاصل ہوئی، مدیر کے علمی رابطے بڑھے اور ادبی تعلقات میں وسعت آئی تو وفیات نگاری رسالے ہی کی نہیں دل کی ضرورت بھی بن گئی گویا اب یہ ذہنی مسئلہ ہی نہیں رہا تھا قلبی معاملہ بھی بن گیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ بیسویں شمارے کے بعد کے ''نعت رنگ'' کے اداریوں میں تسلسل کے ساتھ تعزیتی شذرات لکھنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔اور 'نعت رنگ' کے ہر شمارے میں کئی کئی شخصیات پر تعزیتی شذرات دیکھنے میں آتے ہیں۔

''نعت رنگ'' کے اداریوں میں وفیات نگاری کیوں تحریر کی گئیں؟ ان کے مقاصد کیا تھے؟ ان پر درج بالا سطور میں روشنی ڈالی گئی ہے لیکن خود صبیح رحمانی نے 'نعت رنگ' کے اداریوں میں اس حوالے سے اپنے مؤقف کا اظہار کیا ہے۔ذیل کا اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

''نعت رنگ'' کے ہر تازہ شمارے کی اشاعت پر اپنے مرحوم نعت نگاروں اور نعت کاروں کی یادوں کو تازہ کرنا ہمارا معمول رہا ہے۔یہ وہ عظیم ہستیاں ہیں جو تاعمر ذکر نبی کریم ﷺ کے چراغ روشن کرتی رہی ہیں۔ان سے جڑی یادوں کا ہجوم ان سطور کو لکھتے ہوئے مجھے ہمیشہ اپنے اطراف محسوس ہوتا ہے۔کتنے لہجے، فقرے، اشعار اور واقعات یوں تازہ ہوتے چلے جاتے ہیں گویا ملاقات ہو رہی ہو۔ان عظیم خدمت گزارانِ نعت کی زندگی اور احوال و آثار کا بیان یوں بھی ضروری ہے کہ ہم ان اچھی مثالوں اور خلوص و محبت کے حوالوں کو اپنی آنے والی نسلوں کے لیے اپنے عہد کی تاریخ کے طور پر محفوظ کر جائیں۔یہ

مثالیں اور یہ حوالے ان نئے رہ روانِ نعت کے لیے عزم و حوصلے کا باعث ہوں گے اور وہ ان سے ایک مقصدی زندگی کا ڈھنگ سیکھ سکیں گے، ان بزرگوں کی راہ پر چلتے ہوئے وہ خود اپنی زندگی کے اختتام کو اپنے بعد والوں کے لیے موت کا نوحہ نہیں، بلکہ ایک بامعنی اور دائمی زندگی کا نغمہ بنانے میں کامیاب ہوں گے۔(۱۰)

'نعت رنگ' کے اداریوں میں شائع شدہ تعزیتی تحریریں دراصل ان شعرا و ادبا کی وفیات کا تذکرہ ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے نعت یا 'نعت رنگ' سے جڑے رہے ہیں۔ یہ تمام شخصیات مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان سب کا بنیادی اور مرکزی حوالہ ادب کا بنتا ہے اور ادب میں خاص طور پر نعت کا۔ نعت بیشتر شخصیات کی دلچسپی کا محور و مرکز اور تخلیقی سفر کا بنیادی حوالہ رہی ہے۔ یعنی نعت وہ مرکزی مقام ہے جہاں صبیح رحمانی اور فوت ہونے والی شخصیات کے تعلقات کی سرحدیں آ کر یک جا ہو جاتی ہیں۔ ان میں بعض شخصیات ایسی ہیں جن کے صبیح رحمانی سے گہرے مراسم رہے ہیں اور اکثر شخصیات وہ ہیں جن کا صبیح رحمانی سے تعلق ذاتی مراسم کی سطح پر تو نہیں رہا لیکن تعلق کی نوعیت کا سبب مدحت رسول ﷺ بنی ہے۔ چوں کہ ان شخصیات نے نعت کی خدمت میں زندگی گزار دی تھی اس لیے یہ صبیح کے لیے بھی محبوب شخصیات بن گئی تھیں۔ ان شخصیات کی جدائی صبیح رحمانی کے لیے دوہرے دکھ کا باعث تھی۔ ایک فکری اور نظریاتی رفقا کی جدائی اور دوسری اور سب سے اہم فروغ نعت کا ناقابل تلافی نقصان۔ چناں چہ ان شخصیات پر لکھتے ہوئے صبیح رحمانی کا قلم یادوں کا بھرا ہوا دامن لیے دکھوں اور غموں کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور وہاں سے سوز و گداز سے لبریز گہرہائے آبدار ڈھونڈھ لاتا ہے۔ ان کے خیال میں مرنے والے والوں کی زندگیاں ایک ایسی شخصیت سے وابستگی میں صرف ہوئی تھیں جو محبوبِ خالقِ کائنات اور وجہِ تخلیقِ کائنات ہے۔ اس لیے وہ ان شخصیات کو خوش نصیب سمجھتے ہوئے تعزیتی شذرات میں رشک اور محبت کے جذبات سے اشک بار نظر آتے ہیں۔ ان شخصیات پر لکھتے ہوئے صبیح رحمانی کے جذبے کی شدت اور خلوص کی فراوانی دیدنی ہے۔ مرحومین پر لکھتے ہوئے وہ ماحول کی سوگوار کیفیت کو اپنے اندر اتار لیتے ہیں پھر خود اس کیفیت میں اپنے آپ کو پہلے منتشر کرتے ہیں پھر مجتمع۔ یادوں، باتوں اور خیالات کی خوشبو انھیں حال سے ماضی میں لے جاتی ہے اور پھر وہ حال کی طرف لوٹتے ہیں اور گزرے ہوئے یادگار لمحوں کو خود بھی محسوس کرتے ہیں اور قارئین کو بھی اس کیفیت میں شریک کرتے ہیں۔(۱۱)

'نعت رنگ' کے اداریوں میں تعزیتی شذرات کو دو رنگوں سے پینٹ کیا گیا ہے۔ ایک تو وہ ہے جس کے ذریعے فوت ہونے والی شخصیت کی عظمت کو اس انداز میں اجاگر کیا گیا ہے کہ ہم ان شخصیات کے کارناموں اور حاصلات سے بخوبی واقف ہو جاتے ہیں اور دوسرا وہ رنگ ہے جس کے ذریعے وہ شخصیات کی علمی و ادبی شخصیت کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ شخصیت کی باطنی صورت بھرپور انداز میں سامنے آ جاتی ہے اور ہم انھیں اپنی چشم تصور سے دیکھتے ہی نہیں محسوس بھی کرنے لگتے ہیں۔ وفیات نگاری کی روایت میں خاکہ نگاری کے یہ عناصر اگرچہ بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں لیکن جہاں کہیں بھی تحریر میں آئے ہیں، قارئین کو فکشن کا مزا دیتے ہیں۔ صبیح رحمانی نے اپنے دلکش تخلیقی اسلوب کے ذریعے فوت ہونے والی شخصیات کے

جستہ جستہ ایسے نقوش ابھارے ہیں کہ ہماری دیکھی ہوئی شخصیت معلوم ہوتی ہیں۔ ذیل میں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے جن میں خاکہ نگاری کے بھرپور عناصر موجود ہیں۔

(۱) ''شفقت رضوی نہایت منکسر المزاج اور گوشہ نشیں طبیعت کے مالک تھے۔ میری ان سے ملاقات ۱۹۹۶ء میں ہوئی۔ میں نے انھیں ''نعت رنگ'' کے دو شمارے پیش کیے اور پھر ایک تعلق قائم ہوگیا۔ میں گاہے گاہے انھیں نعت کے حوالے سے کتب فراہم کرتا رہا اور پھر اللہ کی رحمت سے وہ نعت شناسی کی طرف متوجہ ہوئے اور تواتر سے اس موضوع پر لکھنے لگے۔ وہ نہایت غیر جانب دار اور جارح مبصر و نقاد کے طور پر سامنے آئے جس کے لیے شعبۂ نعت کے اکثر احباب ذہنی طور پر تیار نہ تھے، کیوں کہ یہاں تو دل جوئی کا موسم صدیوں سے ڈیرے ڈالے ہوئے تھا سو میں نے اور شفقت رضوی نے کئی دیرینہ دوست کھو دیے انھوں نے ''نعت رنگ'' کے لیے بہت لکھا طویل جائزے، مضامین، تبصرے، دریافت کے عنوان سے کئی اہم اور نادر نعتیہ شہ پاروں کی تلاش اور تعارف ہر شمارے میں ان کی کوئی نہ کوئی تحریر شائع ہونے لگی اور یوں نعتیہ ادب کو ایک معتبر اور صاحب الرائے نعت شناس مل گیا۔

۔۔۔کچھ عرصے بعد انھیں اپنے بچوں کے ساتھ امریکا منتقل ہونا پڑا۔ اس تبدیلی کے لیے نہ وہ قلبی طور پر آمادہ تھے نہ ذہنی طور پر، امریکا سے اکثر ان کے خطوط موصول ہوتے رہے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ وہاں خوش نہیں ہیں۔ زندگی بھر کام کی دھن اور لگن میں وہ قرطاس و قلم سے ایسے وابستہ ہو چکے تھے کہ اب اس سے وقتی جدائی بھی انھیں نا آسودہ کر دیتی تھیں۔ میں اکثر انھیں یہاں سے کتب ارسال کرتا جس پر اپنی رائے کا اظہار وہ اپنے خطوط میں کرتے تھے۔ گویا یہ علمی تحفے انھیں وہاں تر و تازہ رکھنے کا کام سرانجام دیتے تھے لیکن وہ وہاں بھی خاموش نہیں بیٹھے بلکہ انھوں نے اپنی یادداشتیں مرتب کرنا شروع کر دی اور اس کے کچھ حصے انھوں نے ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری صاحب کو ارسال بھی کیے اور ''نعت رنگ'' کے لیے بھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ برکت اللہ بھوپالی اور حسرت کی صحافیانہ زندگی پر بھی انھوں نے کتابیں وہیں مرتب کی پھر اچانک ان کی طبیعت کی خرابی اور وطن واپسی کی خبر آئی۔ ڈیفنس میں اپنے ایک دوست پروفیسر انیس زیدی کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ وطن کی محبت انھیں واپس کھینچ لائی ہے اور یہاں رہ کر مزید کام کرنے کے آرزومند ہیں۔ مجھ سے کہا کہ کوئی موضوع دو، میں حج پر جانے والا تھا میں نے انھیں کافی مرادآبادی کی کتب کی عکسی نقول دی اور کہا اس پر کام کریں۔ بخوشی راضی ہوگئے کوئی بیالیس دن بعد میں واپس لوٹا تو معلوم ہوا کہ طبیعت بہت خراب ہے اور آئی سی یو (ICU) میں ہیں۔ ہسپتال گیا مگر ملاقات نہ ہوسکی گھر چلا آیا، اسی رات یہ اطلاع آگئی کہ ان کا انتقال ہوگیا ہے۔ اپنے کسی خط میں انھوں نے مجھے ایک شعر لکھا تھا جو آج ان کے نصب العین کے طور پر ذہن میں تازہ ہو رہا ہے:

کچھ ایسے کام کرلو جو تم کو زندہ رکھیں
صدیاں کشید کرلو لمحوں کی زندگی سے

شفقت رضوی اپنے اس نصب العین میں کامیاب رہے اس کا گواہ صرف میں ہی نہیں ہماری پوری ادبی دنیا ہے۔(۱۲)

وفیات لکھتے ہوئے صبیح نے شخصیات کے ایسے گوشوں اور پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے جنھیں اس شخص کی نمائندہ جہت کہا جاسکتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان سے شخصیت کے ذہنی رویوں، داخلی احساسات اور کیفیات کا بھی پتا چلتا ہے۔ احمد صغیر صدیقی (۲۰۱۷-۱۹۳۸) ''نعت رنگ'' کے باقاعدہ قاری اور مستقل مزاجی سے اس رسالے میں کبھی خط اور کبھی مضمون کی صورت اپنی موجودگی کا ثبوت دیا کرتے تھے۔ ان کے 'نعت رنگ' کے اکثر خطوط علمی نوعیت اور تنقیدی اظہار کے باوصف کسی مضمون یا مقالے سے کسی طور پر مختلف نہیں۔ کم وبیش تمام خطوط میں ان کی تنقیدی صلاحیت اور ان کا علمی وادبی مطالعہ ساتھ ساتھ کھڑا نظر آتا ہے۔ مدیر نعت رنگ نے ان کی وفات پر لکھتے ہوئے ان کی شخصیت کے اہم گوشوں کی کمال خوب صورتی سے نشان دہی کی ہے۔ احمد صغیر صدیقی پر لکھتے ہوئے انھوں نے چند اشاروں کی مدد سے ان کی شخصیت کے نقوش کو بایں طور ابھارا ہے کہ قارئین نہ صرف چشمِ تصور سے انھیں دیکھ لیتے ہیں بلکہ ان کی شخصیت کے علمی پہلوؤں سے بھی آشنا ہو جاتے ہیں۔ ان سطور سے ان کے خارجی نقوش تو نہیں ابھرتے لیکن ان کے باطن میں اترنے اور داخل میں جھانکنے کا موقع ضرور مل جاتا ہے۔(۱۳)

صبیح رحمانی 'نعت رنگ' کے اداریوں میں فوت ہونے والی شخصیات پر لکھتے ہوئے مرحوم سے متعلق ایسے واقعات اور پہلوؤں کو احاطۂ تحریر میں لاتے ہیں جن سے مرحوم کی نعت سے عقیدت، محبت اور قلبی لگاؤ کے تمام مظاہر آشکار ہو جاتے ہیں۔ ماہر القادری کی طرح شخصیت سے اپنے تعلق کے حوالے نقل کرتے ہیں۔ اسی طرح اس شخصیت سے ان کا تعلق اور 'نعت رنگ' میں پیش کش کا دو طرفہ جواز بھی نکل آتا ہے۔ پیر نصیر الدین نصیر گولڑوی (۲۰۰۹-۱۹۴۹) اور شفیق احمد فاروقی (۲۰۱۴-۱۹۳۹) کے تعزیتی شذرات میں اس کے ثبوت ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ تین مثالیں مزید ملاحظہ فرمائیے:

(۱) ''مولانا عبد العزیز شرقی نے کم وبیش ۲۵ سال مدینۃ الرسول ﷺ میں تسلسل کے ساتھ گزاری اس سے پہلے انھوں نے کئی حج اور عمرے کیے مولانا برصغیر کے ان عظیم صوفیا میں سے ہیں جنھیں جنت البقیع میں جگہ ملی۔ اپنے بیٹے کو انھوں نے وصیت کر رکھی تھی کہ اگر میں بیمار پڑوں اور ہوش میں نہ رہوں تو علاج کے لیے مجھے حدود حرم سے باہر نہ لے جانا۔۔۔ مولانا شرقی جماعت اسلامی کے بنیادی رکن تھے لیکن جب جماعت سے اختلاف ہوا تو خاموشی سے علیحدہ ہو گئے مگر زندگی بھر جماعت یا مولانا مودودی کے خلاف کچھ نہ لکھا۔ سرور کائنات ﷺ کے اس غلام کو اپنے آقا کی ثنا خوانی سے فرصت ملتی تو کسی اور کا ذکر کرتا۔ ایک بار مدینے کے گورنر کے دفتر سے حکم ملا فوراً وطن واپس جاؤ۔ شرقی صاحب مواجہ شریف پر جا کر بیٹھ گئے اور ایک اردو اور ایک فارسی نعت کہی۔ فارسی نعت کے ایک مصرعے میں اپنا عریضہ اس طرح پیش کیا۔

بر در تو نشستہ ام از در تو کجا روم

ترجمہ: ''میں تو آپؐ کے دروازے پر بیٹھ گیا ہوں آپؐ کے دروازے سے کہاں جاوں''

اگلے دن گورنر کے دربار میں پیشی ہوئی۔ گورنر نے چہرہ دیکھا اور کہا کہ شیخ کو اجازۃ العبادہ دیا جائے۔ یوں

مولانا عبدالعزیز شرقی مدینے کی مکین بن گئے۔''(۱۴)

(۲) ''عاصی کرنالی کو مرحوم لکھتے ہوئے دل کٹتا ہے، کتنے زندہ دل اور خوش مزاج آدمی تھے جو ایک بار ان سے مل لے ان کا ہو جاتا تھا۔ شوخی، ذہانت، جملے بازی، خوش اخلاقی اور دل جوئی جیسے اوصاف نے مل کر عاصی صاحب کو باغ و بہار شخصیت بنا دیا تھا۔ تنقید، تحقیق، افسانہ نگاری، خاکہ نگاری، سفرنامہ، غزلیں، مناقب، مراثی، انھوں نے جس طرف رُخ کیا اپنے جوہر تخلیق سے گلستاں آباد کیے مگر نعت ان کے مزاج میں ایسی رچ بس گئی تھی کہ ان کے سرمایہ تخلیق کا غالب حصہ ہمیں نعت ہی پر مشتمل نظر آتا ہے۔۔۔ ۲۰ رجنوری ۲۰۱۱ء کو اپنی تخلیقی زرخیزی سے نعتیہ شاعری سنوارنے اور نکھارنے والا یہ خوب صورت اور صاحبِ اسلوب شاعر اپنی نعت گوئی کو اپنی عاقبت کا توشہ بنا کر یقین کی اس روشنی کے ہمراہ قبر کی تاریکی میں جا سویا:

کفن میں رکھ لیا تھا ایک کاغذ نعتِ روشن کا
یہ کاغذ قبر کی ظلمت میں عاصیؔ میرے کام آیا''(۱۵)

(۳) ''چودھری عبدالغفور قمر نعت کا عمدہ ذوق رکھنے والے قاری تھے۔۔۔ مرحوم نے نہ صرف قدما سے لے کر عصرِ حاضر تک کے نعتیہ گو شعرا کی عقیدتوں کو مجتمع کرنے کی سعی مشکور کی ہے بلکہ اس میں جگہ جگہ ان کے اپنے تاثرات بھی شائع ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نعتیہ شاعری کا مطالعہ اپنے ایک خاص آدرش اور ذوق شعری کے تحت کر رہے تھے اور جہاں جہاں ان کے اس ذوق کی تکمیل احسن طور پر ہوتی نظر آتی تھی وہیں وہ اپنے تاثرات بھی پیش کر دیتے تھے۔ اس انتخاب کے دوران وہ ہر اس شخص کے پاس گئے جس کے بارے میں انھیں علم ہوا کہ وہاں نعت کی کتب موجود ہیں اور یہی تلاش ان کو مجھ تک بھی لائی۔ تقریباً ۱۰۰ رکتب روزانہ وہ منگواتے اور اگلے روز انھیں واپس کر کے ۱۰۰ رمزید نعتیہ مجموعوں کا تقاضا کرتے۔ ایک دن میرے حیرت کرنے پر انھوں نے کہا کہ یہ میری آکسیجن ہے۔''(۱۶)

درج بالا مثالوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صبیح رحمانی نے شعرا کی وفیات تحریر کرتے ہوئے اپنی یادداشتوں کی پوٹلی پر لگی ہوئی گرہوں کو اس طرح کھولا ہے کہ ماضی حال کی تصویر بن کر سامنے آنے لگتا ہے۔ ان وفیات سے بعض ایسی معلومات پر سے بھی پردہ اٹھتا ہے جن کے عینی شاہد خود مدیر نعت رنگ ہیں۔ 'نعت رنگ' میں شامل تعزیتی شذرات کا مطالعہ کیجیے، ان میں بہت سی معلومات تو ایسی ہیں جو مرحومین کے آخری دنوں کی یادداشتوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اسے مرحوم کی زندگی کا اختتامی سین بھی سمجھا جا سکتا ہے اور آخری دنوں کی یادداشتوں کا قیمتی خزانہ بھی۔ ایک مثال ملاحظہ کیجیے:

(۱) ''۲۵ رجون ۲۰۱۲ء کو نعت کے منظر نامے سے ایک اور اہم روشن ستارہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو کر موت کی تاریکی میں گم ہو گیا۔۔۔ ستر کی دھائی سے مسلسل نعت کے مختلف پہلوؤں پر انھوں نے مختلف رسائل و جرائد میں بے شمار مضامین لکھے ہیں اور یہ سلسلہ تا دم مرگ بھی جاری و ساری رہا۔ پاکستان سے شائع ہونے والے تمام رسائل و جرائد میں ان کے مضامین کی شمولیت اس بات کی غماز ہے کہ انھوں نے فروغِ نعت کے لیے نکلنے والے ہر جریدے کی قلمی سرپرستی کی۔ اپنی عمر

کے آخری حصے میں اپنی کتابوں کی ترتیب و اشاعت کے حوالے سے ان کی برق رفتاری سے صاف ظاہر تھا کہ ایک مسافر، سفر پر جانے کی تیاری میں مصروف ہے اور اسے یہ شعور بھی ہے کہ اس سفر پر جو توشہ ساتھ لے جانا ہے اس میں غلامی و عشقِ نبیِ کریم ﷺ کی سند اور دستاویزات ضروری ہیں۔

نعت سرکار مرے دور کی پہچان بھی ہے
میری بخشش کا سرِ حشر یہ سامان بھی ہے

مجھے یقین ہے کہ دنیا میں نعت جس طرح ان کی پہچان اور شناخت کا حوالہ رہی ہے حشر میں بھی ان کی بخشش کا سامان ہوگی! ان شاء اللہ!''(۱۷)

تعزیتی تحریروں میں متاثر کن اور حزن و ملال میں ڈوبا ہوا شذرہ سید اسحاق الدین (۲۰۱۹-۱۹۲۹) کا ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا صبیح رحمانی نے اپنا دکھی دل کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیا ہے اور ہم چشم تصور سے حزن و ملال کی کیفیات اور ماحول کو نہ صرف دیکھ سکتے ہیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں محسوس بھی کر سکتے ہیں۔ اس شذرے کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ احساس جنم لیتا ہے گویا یہ لفظ نہیں چشم غم سے ٹپکنے والے آنسو ہیں جنھوں نے تحریر کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اقبال نے اپنی والدہ کا پرتاثیر مرثیہ لکھا تھا جس میں زندگی اور موت کے فلسفے کو بیان کیا تھا۔(۱۸) صبیح رحمانی نے مختصر سی تحریر میں نہ حیات و ممات کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے نہ والد مرحوم کے اخلاق و فضائل پر لمبی چوڑی تقریر کی ہے فقط اپنا کلیجہ نکال کر صفحۂ قرطاس پر رکھ دیا ہے۔(۱۹)

وفیات نگاری کے سلسلے میں جن مرحومین پر شذرات تحریر کیے گئے ہیں، ان میں سے اکثر نعت گو شعرا ہیں۔ ان شعرا پر لکھتے ہوئے صبیح رحمانی ان کے شعری نمونوں سے ایسا زندہ شعر درج کرتے ہیں جو مرحوم کی تخلیقی جہت اور نعت سے قلبی تعلق کو آشکار بھی کرتا ہے اور اس کے عقیدۂ آخرت پر روشنی بھی ڈالتا ہے۔ اس طرح کے شعر کے اندراج کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قارئین فوت ہونے والے شاعر کے ایک ہی شعر سے یہ اندازہ لگا سکیں کہ مرنے والا نعت کو اپنے لیے کس طرح توشۂ آخرت یا وسیلۂ نجات سمجھتا تھا۔ شذرات کے آخر میں صبیح رحمانی مرنے والے کے عقیدے یا عشق کے مطابق اس کے خاتمے کے لیے دعا کرتے ہوئے اختتامی کلمات کی طرف بڑھتے ہیں۔ جو ایک طرف اختتامی کلمات ہوتے ہیں تو دوسری طرف تعزیت کی ادائیگی۔ دو مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

''دوستو جشن تعیش میں نہ لے جاو مجھے
مجھ کو فقر شہ والا سے حیا آتی ہے

وادیٔ نعت میں اس طہارت فکر و نظر اور نازک خیالی کے ساتھ داخل ہونے اردو کے ممتاز اور پختہ کار نعت گو جعفر بلوچ ۲۷/اگست ۲۰۰۸ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔''(۲۰)

(۲) ''اختر لکھنوی بہت دنوں تک مشاعروں کے اسیر رہے مگر پھر ان کا عشق پھیل کر اور وسیع ہو کر عشق سرورِ کائنات ﷺ کے پیکر میں ڈھل گیا اور ان کے وقت کا بیشتر حصہ نعت گوئی میں صرف ہونے لگا۔ کئی مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت کے لیے گئے۔ ذاکر رسول ﷺ کے کردار میں اخلاق رسول ﷺ کی نمود نظر آنے لگی۔ کوئی تنقید کرتا تو سن کر خاموش ہو جاتے۔ زبان کی یہ نگہداشت آج کے معاشرے میں کم نظر آتی ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے لیکن ان کے تین شعری مجموعوں میں سے دو مجموعے 'سرکار' اور 'حضورؐ' نعتیہ شاعری پر مبنی ہیں جو ان کی نعتیہ شاعری کے ذوق کا مظہر ہیں ان کا یہ شعر تو میرے لوحِ دل پر نقش ہو کر رہ گیا ہے۔

سچ تو یہ ہے ہمیں اچھا نہ لگا اے اختر
ہم سے پہلے درِ سرکارؐ پہ جانا دل کا

مدینے سے اس دلی تعلق کا ثبوت اختر لکھنوی نے یوں بھی فراہم کیا ہے کہ جس دن انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا ان کے ہوائی جہاز کے ٹکٹ پر حرمین شریفین روانگی کی تاریخ بھی وہی درج تھی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان نعت احمدؐ را''(۲۱)

صبیح رحمانی ایک شاعر ہی نہیں نقاد بھی ہیں۔ ان کی تنقیدی تحریروں کے نقوش ان کے اداریوں، مقدمات اور دیگر تحریروں میں بکثرت دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے تنقیدی نقوش اداریوں میں تو موجود ہیں ہی وفیات میں بھی جستہ جستہ نظر آتے ہیں۔ شعرا پر لکھتے ہوئے صبیح کا نقطۂ نظر، ان کے تنقیدی وژن، اصابت رائے اور فکری گہرائی کا عکاس ہے۔ عام طور پر تنقیدی آرا وفیات کے آخری حصے میں نظر آتی ہیں لیکن کہیں کہیں آغاز میں بھی نظر آ جاتی ہیں۔ وفیات لکھتے ہوئے مرحومین کے تخلیقی اور تحقیقی و تنقیدی کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی شاعرانہ قدر و قیمت کا تعین اور شعری فکر کا تجزیہ مختصر مگر جامع انداز میں کیا ہے جسے پڑھ کر محمد حسین آزاد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ قاری ادب کا مزا بھی لے سکتا ہے اور تنقید کا بھی۔ عام طور پر تنقیدی آرا آخری حصے میں لکھی گئی ہیں لیکن کہیں کہیں اس کا اظہار آغاز میں بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ شمارہ نمبر ۲۵ میں شفیق احمد فاروقی پر لکھتے ہوئے ان کی شاعری کا تنقیدی جائزہ آغاز ہی میں لے لیا گیا ہے۔ تعزیتی شذرات سے لیا گیا فقط ایک نمونہ پیش خدمت ہے:

(۱) قرآن و حدیث اور تاریخ کے جو اشارے ان (ابوالامتیاز ع س مسلم) کے کلام میں ظاہر ہوتے ہیں وہ ان کے تبحرِ علمی، عمیق مطالعے اور تحقیق و تجسس کی گواہی دیتے ہیں۔ ان کی نعت کا اساسی موضوع دربارِ رسالت میں حاضری و حضوری ہے کہ سفرِ حضوری ہی سے ان کی نعت گوئی کا آغاز ہوا تھا۔(۲۲)

کچھ شذرات کو پڑھتے ہوئے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ صبیح رحمانی نے انھیں احاطۂ تحریر میں لانے سے قبل تحقیق و تلاش کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔ ان شذرات میں فوت ہونے والی شخصیت کی پیدائش و وفات کے سنین، تخلیقات، تصانیف اور کارگزاریوں کا احاطہ کچھ اس طرح کیا ہے کہ متذکرہ مراحل ان کے محققانہ مزاج اور تحقیقی صلاحیت کا پتا دیتے ہیں۔

یہ ہیں تو تعزیتی شذرات لیکن ان پر مقالے کا گمان گزرتا ہے۔ ان میں سب سے اہم شذرہ ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق (۱۹۱۸-۲۰۱۷) کا ہے۔(۲۳)

'نعت رنگ' میں شامل تعزیتی شذرات ایک طرف ادبی رسائل کی روایت سے جڑے تسلسل کی ایک منفرد مثال پیش کرتے ہیں تو دوسری طرف اردو کے نعتیہ رسائل رصحافت میں ایک ایسے اجتہادی عمل کی بھی نشان دہی کرتے ہیں جس نے نعتیہ صحافت کو ایک نئے رنگ، نئے آہنگ اور نئے ذائقے سے روشناس کیا۔ گزشتہ دو تین دہائیوں میں اردو کے ادبی افق پر کئی نعتیہ رسائل، رسائل نمبر اور انتخابات نمودار ہوئے ہیں۔ ان میں تعزیتی شذرات رمضامین کے جستہ جستہ اور بکھرے ہوئے نقوش تو ضرور دیکھنے میں آتے ہیں لیکن، تعزیتی شذرات کی جو متنوع صورتیں 'نعت رنگ' میں سامنے آئی ہیں، ان کا عشرعشیر بھی متذکرہ رسائل میں نظر نہیں آتا۔ اردو کے ادبی رسائل میں 'نعت رنگ' کا شمار ان چند رسائل میں کیا جاسکتا ہے جس نے اردو رسائل کی روایت کو آگے بھی بڑھایا اور اسے نئے ذائقے، نئے رنگ اور نئے ڈھنگ سے آشنا بھی کیا۔ 'نعت رنگ' میں شائع ہونے والے تعزیتی شذرات تحقیق و تنقید کا رنگ لیے ہوئے بھی ہیں اور خاکہ نگاری کے نقوش سے بھی آراستہ ہیں۔ زبان و بیان کا خوش رنگ اور رسیلا ذائقہ اس پر مستزاد ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ 'نعت رنگ' ایک نعتیہ صحافت کا نمائندہ رسالہ ہی نہیں اردو کے دیگر ادبی رسائل میں بھی ایک منفرد اور قابلِ تقلید مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔

حواشی

(۱) دیکھیے: محمد حسین آزاد، آب حیات، مرتبہ ابرار عبدالسلام، (ملتان: شعبۂ اردو، بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی، ۲۰۰۶ء)، ص ۱۲

(۲) دیکھیے: راوی، مولانا محمد حسین آزاد نمبر، مدیر محمد جاوید غنی، شمارہ نمبر ۲۷، ۱۹۸۳ء، گورنمنٹ کالج، لاہور، ص ۱۱۳

(۳) الطاف حسین حالی نے دیوان حالی میں قطعات تاریخ کے اندراج سے پہلے تاریخ گوئی اور ان کی خود کی تاریخ گوئی کے حوالے سے صلاحیت اور خیالات پر روشنی ڈالی ہے۔ چند سطریں پیش کی جاتی ہیں: ''راقم کو فی الواقع مادۂ تاریخ نکالنے کا ڈھب نہیں ہے اور اگر کبھی ایسی ضرورت پیش آئی ہے تو نہایت دقت سے اکثر تخرجہ یا تعمیہ کے ساتھ اور کبھی حسنِ اتفاق سے بغیر اس کے بھی تاریخ سرانجام ہوئی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ مادۂ تاریخ کسی دوست نے نکال دیا اور اس پر صرف مصرعے لگا کر تاریخ کے مالک بن بیٹھے لیکن چوں کہ غلطی سے تاریخ گوئی کو جزو شاعری سمجھا گیا ہے اس لیے اکثر طوعاً و کرہاً یاروں کی فرمایش سے اور کبھی کبھی اپنی اُپج سے بھی تاریخیں لکھنی پڑی ہیں۔۔۔۔ یہی حال ہمارے ملک میں ان لوگوں کا ہے جو شاعری میں بدنام ہیں۔ وہ اور تو کسی مصرف کے سمجھے نہیں جاتے اور درحقیقت ہیں بھی نہیں البتہ لوگوں کی غرض کبھی کبھی اُن سے اس وقت متعلق ہو جاتی ہے جب کوئی مہتم بالشان واقعہ ظہور میں آتا ہے۔۔۔ جو شخص مادۂ تاریخ فی الواقع یا صاحب فرمایش کے نزدیک سب سے اچھا نکال لاتا ہے اس کا فی الجملہ اعتبار بڑھ جاتا ہے۔'' تفصیل کے لیے دیکھیے، الطاف حسین حالی، دیوان حالی، (لکھنؤ: الناظر بک ایجنسی، س ن)، ص ۱۸۰-۱۷۹

(۴) تفصیل کے لیے دیکھیے: اودھ اخبار اور تفتہ کی وفات کی تاریخیں، ابرار عبدالسلام، سہ ماہی اردو، ۱۴-۲۰۱۳ء۔ یہی

مقالہ فکر و تحقیق، دہلی، جولائی ستمبر ۲۰۱۶ء جلد نمبر ۱۹، شمارہ نمبر ۳ میں بھی شائع ہوا۔

(۵) دیکھیے: خاتون، علی گڑھ۔ ۱۹۱۱ء، ص ۲۶۴۔ ۲۶۳

(۶) دیکھیے: الولی حیدر آباد، اگست ۱۹۷۵ء، مارچ ۱۹۷۶ء، اگست ۱۹۷۶ء، اکتوبر ۱۹۷۶ء، دسمبر ۱۹۷۶ء، اپریل ۱۹۷۷ء، اکتوبر ۱۹۷۷ء، نومبر ۱۹۷۷ء، اپریل ۱۹۷۸ء، اور جون ۱۹۷۸ء

(۷) ڈاکٹر محمد سہیل شفیق (مرتب)، وفیاتِ معارف، (کراچی: قرطاس، ۲۰۱۳ء)، ص ۴۵

(۸) دیکھیے: محمد شاہد حنیف (مرتب)، اشاریہ ماہنامہ برہان دہلی، (لاہور: اوراق پارینہ پبلشرز، س ن)، ص ۱۸

(۹) دیکھیے: نعت رنگ، شمارہ نمبر ۲۹، اکتوبر، ۲۰۱۹ء، نعت ریسرچ سنٹر، کراچی، ص ۱۳۔ اس حوالے سے مدیر کا بیان ملاحظہ فرمایئے:

نعت رنگ کے ابتدایئے میں وفیات کے مرحلے تک آتے ہی جہاں دل زخم زخم ہوجاتا ہے وہیں مدحِ نبی کریم ﷺ وابستہ ان خوش بختوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے اور ان کی یاد کو تازہ کرتے ہوئے روح سکون بھی پاتی ہے، شاید ہم اسی طرح اپنے احساسِ غم کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

(۱۰) نعت رنگ، شمارہ نمبر ۲۸، نومبر ۲۰۱۸ء، ص ۱۰

(۱۱) اس حوالے سے دو اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

(۱) ''نعت رنگ کے ہر شمارے میں تحریر کی ایک منزل ایسی بھی آتی ہے جب میرا قلم وفیات کی وادی میں اترتا ہے ان ساعتوں میں دل کا عجب عالم ہوتا ہے ہزار ضبط کے باوجود بچھڑنے والوں کا غم اشکوں کے سیل رواں کی صورت امنڈ آتا ہے کئی راتیں ایسی گزرتی ہیں جن میں مرحومین کی یادوں کا ہجوم جاگتا ہے اور جگاتا ہے

اشکِ غم و الم سے ہیں آنکھیں بھری ہوئی
پھرتا ہوں کشتیوں میں سمندر لیے ہوئے
(ذوقی مظفر نگری)

ایسی حالت میں حواس پر قابو رکھنا اور کچھ لکھنا کہاں ممکن رہتا ہے! مگر میری خواہش صرف یہ ہوتی ہے کہ اسم محمد ﷺ کے سائبان میں زندگی گزارنے والے ان خوش نصیبوں کا کچھ نہ کچھ تذکرہ مدح نبی کریم ﷺ کی اس عصری دستاویز میں محفوظ ہوجائے۔ یہ ہماری تہذیبی ضرورت ہے ورنہ ان کے غلاموں کو ہمارے تذکرے کی ضرورت نہیں وہ جس ذکر سے رشتہ قائم کرچکے ہیں وہ ذکر ہی ان کی دائمی زندگی کی ضمانت فراہم کرتا ہے بقول شاہ انصار الٰہ آبادی:

ان پہ مرتے ہیں تو مرتے نہیں مرنے والے

('نعت رنگ'، شمارہ نمبر ۲۵، اگست ۲۰۱۵ء، ص ۵۲۔۵۱)

(۲) ''نعت رنگ'' کے ہر شمارے میں بعض رفیقانِ سفر کی جدائی کا ذکر کرتے ہوئے دل کی عجب حالت ہوتی ہے۔ موت ایک حقیقت ہے، مگر جانے والے اور خاص طور پر آپ کے فکری یا نظریاتی رفقا جو نعت کے فروغ میں آپ کے ساتھ شانہ بہ شانہ مصروفِ عمل رہے ہوں، ان کی جدائی معمولی صدمہ نہیں رہتی:

کتنے رفیق ہم سے اچانک بچھڑ گئے
اب ان کی زندگی بھی بسر کر رہے ہیں ہم
(نیاز بدایونی) ('نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۷، دسمبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۴)

(۱۲) 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۲، ستمبر ۲۰۱۱ء، ص ۲۱۔ اس حوالے سے امجد صابری کا تعزیتی شذرہ بھی ملاحظہ کیجیے۔ ('نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۶، دسمبر ۲۰۱۶ء، ص ۱۶)

(۱۳) 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۷، دسمبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۹۔۱۸، اس کی شہادت ذیل کے اقتباس سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''تھے یہاں سارے عمل ردِعمل کے محتاج
زندگی بھی ہمیں درکار تھی مرنے کے لیے

احمد صغیر صدیقی بھی چلے گئے، ان کا یہ خوب صورت شعر ان کے شعری مجموعے ''لمحوں کی گنتی'' میں کبھی نظر سے گذرا تھا، آج اس اندوہناک خبر نے ذہن میں یہ شعر تازہ کر دیا۔ احمد صغیر صدیقی بحیثیت شاعر، ادیب، نقاد، کہانی کار اور مترجم کے عصری ادبی منظرنامے پر اپنی شناخت اور اعتبار کے رنگوں کو گہرا کر چکے تھے۔۔۔ ہندو پاک کے تمام قابل ذکر رسائل و جرائد میں ان کا کلام اور تحریریں تواتر سے شائع ہوتی رہیں۔ نعت رنگ سے انھیں بے حد محبت تھی اور وہ مذہبی شاعری کے حوالے سے اٹھنے والے سوالات اور ان کے جواب میں شائع ہونے والے مضامین کو بہت توجہ اور شوق سے پڑھتے تھے۔ نعت رنگ میں ان کے مستقل خطوط شائع ہوتے رہے ہیں اور ہر خط میں وہ بعض نکات ایسے اٹھاتے تھے جس پر لوگوں کا ردِعمل نعتیہ تنقید میں نئے مباحث کو جنم دیتا تھا۔۔۔ انھوں نے نعت رنگ کے لیے بعض مضامین بھی لکھے جو ان کی تنقیدی بصیرت اور جرأتِ اظہار کا آئینہ خانہ ہیں۔''

(۱۴) نعت رنگ، شمارہ نمبر ۰۲، دسمبر ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۔۱۰

(۱۵) نعت رنگ، شمارہ نمبر ۲۲، ستمبر ۲۰۱۱ء، ص ۲۱

(۱۶) نعت رنگ، شمارہ نمبر ۲۱، س۔ن، ص ۱۸

(۱۷) نعت رنگ، شمارہ نمبر ۲۳، اگست ۲۰۱۲ء، ص ۲۴۔ ۲۳

(۱۸) دیکھیے: والدہ مرحومہ کی یاد میں، بانگِ درا، مشمولہ کلیات اقبال اردو، (لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۹۰ء)، ص ۲۶۶۔ ۲۵۴

(۱۹) دیکھیے: نعت رنگ؛ شمارہ نمبر ۲۹، اکتوبر ۲۰۱۹ء، ص ۱۳۔ ملاحظہ فرمائیے:

''۱۷/اگست رات بارہ بجے سے کچھ اوپر کا وقت تھا جب وہ ہاتھ جس کی انگلی تھام کر میں نے زندگی کے راستوں پر کھڑا ہونا، چلنا اور پھر دوڑنا سیکھا، میرے ہاتھوں میں دیکھتے دیکھتے زندگی کی حرارت سے محروم ہوگیا۔ کیسا لمحہ تھا، کیا بے بسی، ہائے ہائے۔ طبیعت تو ان کی کئی برسوں سے خراب تھی مگر پچھلے پانچ برس سے وہ مستقل بسترِ علالت پر رہے، کمزوری اور بیماریوں سے لڑتا جسم روز بہ روز نڈھال ہوتا جارہا تھا، سماعت اور بصارت معدوم ہو چکی تھیں۔ نہ کچھ کہنے کے قابل نہ سننے کے، تاہم ان کے ہونے کا احساس بھی بہت تھا۔ ان کے ماتھے پر بوسے کی حلاوت، ان کے ہاتھوں کو ہاتھوں میں لے کر سہلانے کے عمل سے میسر آنے والی جذبوں کی آسودگی، ان کی کمر اور پیروں کو آہستگی سے دبانے کے سعادت آثار لمحے، ان کو آواز دے کر ان سے کسی جواب کی موہوم سی اُمید۔ ان کے چلے جانے سے اچانک کیا کچھ چھن گیا ہے جیسے کسی نے سر سے آسمان اور پیروں سے زمین کھینچ لی ہو۔ کہیں خلا میں متعلق سا ہو کر رہ گیا ہوں۔ گھر جاؤں تو ان کا خالی بستر اور والدہ کی خالی آنکھیں دیکھنا کسی قیامت سے کم نہیں۔ یہ صرف میرا ہی نہیں میرے تمام بھائی بہنوں کا احوال ہے۔ ذہن و دل ویران ہیں اور قلم کچھ لکھنے پر آمادہ نہیں۔

نظروں میں بھی ہے، دل سے بھی مستور نہیں ہے
نزدیک نہ ہو کوئی مگر دور نہیں ہے۔

میں اپنے والد کی وفات پر ساری دنیا سے اہلِ محبت کے تعزیتی پیغامات اور ایصالِ ثواب کی محافل کے انعقاد پر تہِ دل سے ممنون

ہوں اور قارئینِ نعت رنگ سے بھی دعا کے لیے التماس گزار ہوں کیوں کہ اگر مجھ میں کوئی وصف ہے تو وہ میرے والد کی تربیت کا فیض ہے۔ دعا ہے کہ اللہ کریم ان کی کامل مغفرت فرمائے اور انھیں شفاعتِ نبی کریم ﷺ نوازے۔ آمین!''

(۲۰) نعت رنگ، شمارہ نمبر ۲۲، ستمبر ۲۰۱۱ء، ص ۲۰

(۲۱) نعت رنگ، شمارہ نمبر ۰۲، دسمبر ۱۹۹۵ء، ص ۱۱

(۲۲) نعت رنگ، شمارہ نمبر ۲۸، نومبر ۲۰۱۸ء، ص ۱۴

(۲۳) دیکھیے: نعت رنگ، شمارہ نمبر ۱۸، نومبر ۲۰۱۸ء، ص ۱۲۔۱۰

مآخذ:

(۱) اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال اردو، لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۹۰ء

(۲) آزاد، محمد حسین، آبِ حیات، ابرار عبدالسلام، (مرتب)، ملتان: شعبۂ اردو، بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی، ۲۰۰۶ء

(۳) حالی، الطاف حسین، دیوانِ حالی، لکھنؤ: الناظر بک ایجنسی، س ن

(۴) حنیف، محمد شاہد (مرتب)، اشاریہ ماہنامہ برہان دہلی، لاہور: اوراق پارینہ پبلشرز، س ن

(۶) شفیق، محمد سہیل، ڈاکٹر (مرتب)، وفیاتِ معارف، کراچی: قرطاس، ۲۰۱۳ء

رسائل:

(۲) سہ ماہی اردو، انجمن ترقی اردو، کراچی، شمارہ نمبر ۲۰۱۴-۲۰۱۳، جلد نمبر ۹۰-۸۹

(۵) الولی، شاہ ولی اللہ اکیڈیمی، حیدر آباد، اگست ۱۹۷۵ء، مارچ ۱۹۷۶ء، اگست ۱۹۷۶ء، اکتوبر ۱۹۷۶ء، دسمبر ۱۹۷۶ء، اپریل ۱۹۷۷ء، اکتوبر ۱۹۷۷ء، نومبر ۱۹۷۷ء، اپریل ۱۹۷۸ء، اور جون ۱۹۷۸ء

(۴) خاتون، مدیر شیخ محمد عبداللہ، مطبع ریاض ہند، علی گڑھ۔ ۱۹۱۱ء

(۱) راوی، مولانا محمد حسین آزاد نمبر، گورنمنٹ کالج لاہور، شمارہ نمبر ۷۲، ۱۹۸۳ء،

(۸) فاران، کراچی، مختلف شمارے

(۳) فکر و تحقیق، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، جولائی ستمبر ۲۰۱۶ء جلد نمبر ۱۹، شمارہ نمبر ۳

(۷) قومی زبان، انجمن ترقی اردو، کراچی، نومبر ۱۹۶۴ تا نومبر ۲۰۱۰ کے متعدد شمارے

(۶) نعت رنگ، نعت ریسرچ سنٹر، کراچی، شمارہ ایک تا تیس، اشاعت مارچ ۱۹۹۵ تا ۲۰۲۰